مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب' از : ڈاکٹر اسرار احمد

درس ۹

اثباتِ آخرت کیلئے قرآن کا استدلال

سورۃ القیامہ کی روشنی میں (۲)

○

پہلی دو آیات : قیامت کے دن اور نفسِ ملامت گر کی قسم

﴿ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ ﴾

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ـــ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی!!"

سورۃ القیامہ کی ابتدائی دو آیتوں میں وارد شدہ قسموں میں اللہ تعالیٰ نے اس تمام استدلال کو کمال ایجاز و اعجاز کے ساتھ سمو دیا ہے جو اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے ضمن میں طویل مکی سورتوں میں شرح و بسط اور اطناب و تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

ان دونوں قسموں کے نفسِ مضمون پر کلام سے قبل اس حرفِ نفی یعنی "لَا" کے بارے میں وضاحت مناسب ہے جو دونوں قسموں سے متصلاً قبل اور دونوں آیتوں کے شروع میں آیا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا ایک خاص اسلوب ہے جو اس سورۂ مبارکہ کے علاوہ قرآن مجید کی چھ مزید سورتوں (الواقعہ' الحاقّہ' المعارج' التکویر' الانشقاق اور البلد) میں بھی وارد ہوا ہے' اور اس کے بارے میں اگرچہ بعض دوسری آراء اور تاویلات بھی موجود ہیں' تاہم بہترین رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ یہ رسم الخط کے اعتبار سے تو "لاءِ متصل" نظر آتا ہے' لیکن واقعتاً "لاءِ منفصل"

ہے' یعنی حرفِ نفی "لَا" علیحدہ ہے اور "اُقْسِمُ" علیحدہ' لیکن چونکہ عربی زبان میں انگریزی کی طرح علامتیں اور اوقاف نہیں ہیں لہٰذا یہ فرق اسلوبِ بیان اور مضمون کے سیاق و سباق پر غور کرنے ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ اسے یوں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ایک خطیب خطبہ شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کے جو سامعین و مخاطبین ہوتے ہیں' ان کے ذہنوں میں کچھ اشکالات' اعتراضات اور سوالات ہوتے ہیں۔ چنانچہ خطیب ان کی تردید سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہے اور کہتا ہے "لَا" یعنی ہرگز نہیں! تمہارے خیالات غلط ہیں۔ تمہارے اشکالات باطل ہیں۔ تمہارے اعتراضات بے وزن ہیں ـــــ اور پھر اپنے موقف کو بیان کرنے سے قبل اپنے یقین و اذعان کے اظہار کے لئے کوئی قسم کھاتا ہے جس کے لئے لفظ "اُقْسِمُ" استعمال کرتا ہے' جیسے یہاں قسم کھائی گئی۔ یعنی "میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی"۔ گویا قیامت اتنی یقینی' اتنی حتمی اور اتنی قطعی ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ اسی طرح دوسری آیت پڑھئے : "اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ یہ آغاز خود بتا رہا ہے کہ یہ انداز و اسلوب خطیبانہ ہے۔ جیسے ایک خطیب پہلے سے جانتا ہے کہ اس کے سامنے جو سامعین و حاضرین موجود ہیں اور اس کے جو مخاطبین ہیں' ان کے ذہنوں میں کیا کیا وسوسے' کیا کیا اشکالات اور کیا کیا اعتراضات ہیں' اور وہ کن کن وجوہ اور اسباب کی بنیاد پر قیامِ قیامت اور وقوعِ آخرت کو بالکل ناممکن اور بعید از قیاس سمجھ رہے ہیں۔ لہٰذا خطیب ان کے تمام اشکالات' اعتراضات اور وسوسوں کی نفی و تردید کے لئے لاءِ نفی سے اپنے خطبے کا آغاز کر رہا ہے۔

۱۔ قیامت کی قسم!

اور اب توجہ کو مرتکز کیجئے ان دو قسموں کے نفسِ مضمون پر ـــــ ان میں سے پہلی قسم ہے خود قیامت کے دن کی۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تمہارے ذہنوں میں شبہات و اشکالات ہیں' تمہارے دلوں میں وسوسے ہیں کہ دنیا کے آغاز سے لے کر قیامِ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان کیسے دوبارہ اٹھائے جا سکیں گے اور انہیں دوبارہ کیسے زندہ کیا

جاسکے گا؟ پھر ان سب انسانوں کے جملہ اعمال و افعال اور وہ بھی جملہ تفصیلات کے ساتھ کہاں محفوظ ہوں گے؟ مزید برآں ان اعمال و افعال کی پشت پر کارفرما نیتیں اور ارادے کس کے علم میں ہوں گے؟ لہٰذا یہ محاسبہ اور جزا و سزا کا معاملہ کیسے ظہور پذیر ہو سکے گا؟ لیکن یہ وقوعِ قیامت اس قدر یقینی' قطعی اور حتمی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میں اس دن کی قسم کھاتا ہوں"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس میں دلیل کونسی ہے؟ اس لئے کہ اگر کوئی شخص کوئی دعویٰ پیش کرے اور اس سے اس دعوے کے لئے کوئی دلیل طلب کی جائے تو جواب میں وہ اس پر صرف قسم کھانے پر اکتفا کرے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسلوب اور اصول میں بھی ایک دلیل مضمر ہے' اور وہ دلیل ہوتی ہے خود متکلّم کی شخصیت کی۔ اگر کوئی صاحبِ کردار انسان جس پر اعتماد کیا جاتا ہو' جس کی صداقت کی گواہی دی جاتی ہو' جب وہ کوئی بات کہتا اور قسم کھا کر کہتا ہے تو اس کے قسم کھانے سے اس کی بات میں نمایاں وزن پیدا ہو جاتا ہے جو درحقیقت اور اصلاً اس شخص کی اپنی شخصیت کا ہوتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ یہاں قسم کھانے والا کون ہے! ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتے ہیں' قسم کھانے والا خود اللہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو اللہ کا کلام ماننے والے صاحب ایمان پر تو اس کا لازمی اثر یہ پڑے گا کہ اس کا دل لرز جائے گا اور وہ کانپ اٹھے گا کہ قیامت کا دن اتنا یقینی' حتمی اور قطعی ہے کہ خود خالق کون و مکاں نے اس کی قسم کھائی ہے۔

رہے وہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تو وہ بھی اس قسم کو لامحالہ منسوب کریں گے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ اور اس صورت میں بھی اس قسم کی تاثیر ختم نہیں ہو گی بلکہ باقی رہے گی' اس لئے کہ حضورؐ کی شخصیتِ مبارکہ اور سیرتِ مطہرہ کا وزن اس کی پشت پر پھر بھی موجود رہے گا کہ یہ قسم وہ کھا رہا ہے جس کی صداقت و امانت کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے۔ یہ مضمون اس سے قبل سورۃ التغابن کی آیت نمبر ۷ کے الفاظِ مبارکہ ﴿ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ﴾ "(اے نبیؐ) کہہ دیجئے : کیوں نہیں! اور مجھے میرے رب کی قسم ہے کہ تم

لازماً دوبارہ اٹھائے جاؤ گے اور پھر تم لازماً جتلا دیئے جاؤ گے جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے رہے ہو" کی تشریح و توضیح کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ چنانچہ سیرتِ مطہرہ کا اہم واقعہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل سے یہ پوچھا گیا کہ "کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ محمدؐ جھوٹ بولتے ہیں" تو اس نے کہا "ہرگز نہیں! انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا"۔ پھر جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ "پھر تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟" تو اس نے بڑی صفائی کے ساتھ اقرار کیا کہ "اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنو ہاشم کے مابین ایک مسابقت اور مقابلہ جاری ہے۔ انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے' انہوں نے مہمان نوازیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں' ہم اب تک ان کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کے ایک فرد کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ہمیشہ کے لئے ان کے تابع ہو جائیں گے اور یہ بات مجھے کسی طور پر بھی گوارا نہیں"۔ معلوم ہوا کہ ابوجہل جیسا دشمنِ خدا و رسولؐ بھی حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ کا الزام نہیں لگا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور ﷺ کو حکم ہوا : ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر : ۹۴) "پس اب (اے نبیؐ) آپؐ برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہئے وہ بات جس کا آپؐ کو حکم ملا ہے" اور آپؐ پہلے "خطابِ عام" کے لئے کوہ صفا پر کھڑے ہوئے تو چونکہ اس زمانے میں رواج تھا کہ اگر کوئی اہم خبر لوگوں کو پہنچانی مقصود ہوتی تھی تو خبر پہنچانے والا کسی بلند مقام پر بے لباس ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا "وَاصَبَاحَا" (ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے) چنانچہ لوگ اس کی آواز سن کر اور جن تک آواز نہیں پہنچتی تھی وہ دور سے یہ دیکھ کر کہ ایک "ڈرانے والا" پہاڑی پر کھڑا ہے' اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اس رواج میں یہ ترمیم فرماتے ہوئے کہ کپڑے نہیں اتارے' اس لئے کہ یہ بات کسی طرح بھی آپؐ کے شایانِ شان نہ تھی اور آپؐ تو حیا کا پیکرِ اعظم تھے' باقی سارا معاملہ معمول کے مطابق کیا اور کوہ صفا پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند فرمایا : "وَاصَبَاحَا"۔ اور جب آپؐ کی یہ ندا سن کر اور آپؐ کو کوہ صفا پر کھڑا دیکھ کر لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تو آپؐ نے دعوت پیش کرنے سے پہلے لوگوں سے سوال کیا "لوگو!

تم نے مجھے کیسا پایا؟" مجمع نے بیک زبان تسلیم کیا کہ آپؐ سچے بھی ہیں اور امانت دار بھی! لہٰذا جو لوگ قرآن مجید کو منزّل مِنَ اللہ نہیں مانتے اور ان کے نزدیک اس کلام کے متکلم خود محمد (ﷺ) ہیں' ان کے لئے حضورؐ کی شخصیت کا پورا وزن اور پورا زور اس قسم کی پشت پر موجود ہے کہ ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ "کیوں نہیں! مجھے قسم ہے قیامت کے دن کی"۔ یعنی میں قیامت کے وقوع کو اتنا یقینی' قطعی اور حتمی مانتا ہوں کہ اس کے یقینی اور رشدنی ہونے پر خود اس ہی کی قسم کھاتا ہوں!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے سورۃ التغابن کی آیت نمبر ۷ میں نبی اکرم ﷺ سے جو قسم کھلوائی گئی تھی اس کا بھی یہی مفاد اور انداز تھا۔ اصطلاح میں اس کو "دلیلِ خطابی" کہا جاتا ہے جس میں دلیل کی حیثیت متکلم کے اپنے یقین واثق اور اس کی اپنی بے داغ شخصیت اور اعلیٰ سیرت کو حاصل ہوتی ہے اور جس کے ذریعے متکلم کا یقین اور اذعان مخاطبین میں منتقل ہوتا اور سرایت کرتا ہے۔

۲۔ نفسِ ملامت گر کی قسم!

اب آیئے دوسری دلیل کی طرف۔ ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ "اور کیوں نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ اس بات کو ایک آفاقی و عالمی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان کے باطن میں ایک حقیقت پوشیدہ ہے جسے ضمیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان جب کوئی برا کام کرتا ہے تو اسے اندر سے ضمیر کی خلش کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اس لئے کہ برے سے برا انسان بھی یہ جانتا ہے کہ برائی برائی ہے اور بدی بدی ہے' اور اگرچہ مختلف اسباب اور محرکات کے تحت وہ کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے' لیکن عین اُس وقت بھی وہ یہ جانتا ہے کہ یہ کام برا ہے اور اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کا ضمیر اسے اندر ہی اندر کچوکے دے رہا ہے۔

اسی احساس اور اسی کیفیت کو اس آیتِ مبارکہ میں "نفسِ لوّامہ" قرار دیا گیا ہے اور آیتِ مبارکہ میں اس کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس لئے کہ نفس انسانی کی یہ مضمر حقیقت

جو عالمی اور آفاقی سطح پر مسلم سچائی کی حیثیت رکھتی ہے' وقوع قیامت پر سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ مؤثر دلیل ہے۔' جسے قرآن حکیم نے اسلوب اور الفاظ کے فرق اور تنوع کے ساتھ بہت سے مقامات پر' کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ' بیان کیا ہے۔

اس دلیل کا اگر کسی قدر تفصیلی تجزیہ کیا جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نیکی اور بدی کو پہچانتا ہے' ان میں تمیز کرتا اور ان کے فرق و تفاوت کو خوب جانتا اور پہچانتا ہے۔ گویا یہ پہچان اور یہ شعور فطرت انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ چنانچہ آخری پارہ کی سورۃ الشمس میں فرمایا گیا : ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○﴾ "اور گواہ ہے نفس انسانی اور جیسا کہ اسے بنایا اور سنوارا' پھر اس میں فجور و تقویٰ (برائی اور اچھائی اور بدی اور نیکی کا علم) الہامی طور پر ودیعت کر دیا"۔ چنانچہ ہر شخص جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برائی ہے اور سچ بولنا اچھائی ہے' وعدہ خلافی برائی ہے اور ایفائے عہد بھلائی ہے' کسی کو دھوکہ دینا شر ہے اور کسی کی صحیح رہنمائی کرنا خیر ہے' ظلم و استحصال اور تعدّی و حق تلفی بدی کے کام ہیں' جبکہ عدل و انصاف' ہمدردی و خیر خواہی اور خدمتِ خلق نیکی کے کام ہیں۔ یہ سب عالمی اور آفاقی سچائیاں ہیں اور ان کے ضمن میں کہیں بھی انسانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اب اگر یہ حقیقت ہے' جیسی کہ وہ فی الواقع ہے' اس لئے کہ اس کے حقیقت ہونے پر سب سے بڑا گواہ ہے ہمارا اپنا ضمیر' ہمارا اپنا نفسِ ملامت گر اور ہمارا اپنا ذاتی احساس کہ اگر کسی سبب سے ہم سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے یا کسی برے کام کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو ہمارا اپنا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے کہ تم نے یہ برا کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان معدودے چند لوگوں کا معاملہ ذہن سے نکال دیجئے جن کی فطرت بالکل ہی مسخ ہو چکی ہو' جن کے دل پتھر بن گئے ہوں' جن کا ضمیر مُردہ ہو چکا ہو' جو اتنے کٹھور دل ہو چکے ہوں کہ انسانیت کی کوئی رمق بھی ان میں باقی نہ رہی ہو اور جن کی خود غرضی اور مفاد پرستی جملہ اخلاقی اقدار پر مسلط ہو چکی ہو۔ ان لوگوں کی حیثیت ان استثنا آت کی ہے جو قواعد و کلیات کو مزید ثابت اور مؤکّد کرتے ہیں۔ ورنہ قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ فطرتِ

انسانی نیکی اور بدی اور خیر و شر کے مابین واضح طور پر فرق اور تمیز کرتی ہے۔ فطرتِ انسانی کی اس بدیہی حقیقت پر اگر عقل سلیم کے اس مسلّمہ اصول کا اطلاق کیا جائے کہ ع "گندم از گندم بروید' جو ز جو!" تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو نیک اعمال کا اچھا صلہ ملنا چاہئے اور بداعمالیوں کی سزا ملنی چاہئے' جبکہ فی الواقع جو صورت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں نیکی کا بدلہ بھلائی کی صورت میں اکثر و بیشتر تو بالکل ملتا ہی نہیں اور اگر ملے بھی تو نیکی کی مناسبت سے نہیں ملتا۔ اسی طرح بدی کی سزا اکثر و بیشتر تو ملتی ہی نہیں۔ اگر ملتی بھی ہے تو جرم کے تناسب کے ساتھ نہیں ملتی۔ مثلاً ہٹلر کا نام ذہن میں لایئے جس کی ہوس اقتدار اور جوع الارض کی وجہ سے لاکھوں انسان مارے گئے' لاکھوں خواتین بیوہ ہوئیں' کروڑوں بچے یتیم ہو گئے' ہزاروں افراد اپاہج ہو گئے' لاکھوں گھر تباہ و برباد ہو گئے اور ان کے مکین بے خانماں ہو گئے۔ نوعِ انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتنا بڑا اور ہولناک جانی و مالی نقصان نوعِ بشر کو مجموعی طور پر ہٹلر کی ہوسِ ملک گیری اور نسلی برتری کے زعم باطل کے باعث پہنچا۔ اب اگر ہٹلر گرفتار ہو جاتا اور اس کے جسم کا ایک ایک ریزہ بھی کر دیا جاتا تو کیا اسے اپنے جرائم کی پوری سزا مل جاتی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک گولی سے خود اپنی زندگی ختم کر لی اور وہ اپنے جرائم کی دنیوی سزا سے بالکل بچ گیا۔ معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے یہ دنیا ناقص ہے۔ یہاں قوانینِ طبعیہ تو پورے طور پر بروئے کار آ رہے ہیں' آپ اگر آگ میں انگلی ڈالتے ہیں تو وہ جل جاتی ہے' آپ کوئی سم قاتل اور زہر ہلاہل کھائیں گے تو مر جائیں گے' لیکن لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو کوئی گزند نہیں پہنچتا' زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا' لوگ حرام خوریاں کرتے ہیں تو سب رچ پچ جاتا ہے' کسی نوع کے دردِ شکم تک سے سابقہ پیش نہیں آتا' لوگ حق تلفیاں کرتے ہیں' رشوتیں لیتے دیتے ہیں' جبر و استحصال اور ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں تو اس طرح جو جتنا مالدار اور دولت مند ہوتا ہے' معاشرے میں اس کی اسی اعتبار سے عزت بڑھتی چلی جاتی ہے' حالانکہ اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اس کی دولت مندی اور مالداری کی حقیقت کیا ہے اور کن ناجائز ذرائع سے اس نے دولت حاصل کی ہے۔ الغرض ایسے لوگ دنیا میں گلچھرے اڑاتے ہیں' عیش کرتے ہیں' آسودہ حال رہتے ہیں'

صاحبِ عزّت و شرف سمجھے جاتے ہیں جن کے کوئی اصول نہیں ہیں' جو جائز و ناجائز' حرام و حلال اور خیر و شر کی تمیز اور اس بات کا رتی بھر لحاظ رکھے بغیر کہ ان کے اس طرزِ عمل سے قومی و ملی مفادات اور ملکی معیشت کو کتنا مہلک نقصان پہنچ رہا ہے' ہر نوع کی جعل سازی سے دن رات دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے لوگوں کے لئے زندگی کی ناگزیر ضروریات فراہم کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے جو جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں' حلال اور حرام میں فرق کریں' صحیح اور غلط کا لحاظ رکھیں اور اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا پاس کریں۔

اب یا تو یہ مانا جائے کہ یہ دنیا نری اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہے اور یہ تخلیق عبث اور بے مقصد ہے' ورنہ ایک دوسری زندگی کو ماننا لازم ٹھہرے گا' جس میں جزا و سزا کا قانون بھرپور طور پر بروئے کار آئے۔ یاد ہو گا کہ بالکل یہی بات سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے مطالعہ کے دوران ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا' سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ یعنی "اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد' بے کار اور عبث پیدا نہیں کیا۔ تو اس سے پاک اور اعلیٰ و ارفع اور منزّہ و مبرّا ہے (کہ کوئی کام بے کار و بے مقصد کرے! تیری تخلیق کا یہ محکم نظام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ملے گی۔) پس (اے ہمارے رب) ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیو!" لہٰذا عقل و منطق کی رو سے بدیہی طور پر لازم آتا ہے کہ اگر خیر خیر ہے' شر شر ہے' نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو ایک دوسری زندگی لازماً ہونی چاہئے جس میں ان اعمال کے پورے نتائج ظاہر ہوں' نیکی کا بھرپور صلہ اور پورا پورا بدلہ ملے اور بدی کی بھرپور سزا ملے۔ الغرض یہ ہے قرآن حکیم کا بدیہیاتِ فطرت پر مبنی استدلال جو وہ ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" کے مصداق مختلف اسالیب سے متعدد مقامات پر' کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اجمال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ القلم میں ارشاد فرمایا گیا ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝﴾ یعنی سوچو تو سہی' کیا ہم اپنے فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ کیا تم لوگوں کی مت ماری گئی ہے کہ ایسا

حکم لگاتے ہو؟ ـــــ اگر واقعتاً کوئی اور زندگی نہیں ہے اور نہ کوئی آخرت ہے نہ محاسبہ' نہ جزا و سزا تو مجرم اور باغی تو مزے میں رہے کہ انہوں نے دنیا میں اس پر عمل کیا کہ ع "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ گویا عقلی اور منطقی طور پر ان لوگوں کی روش زیادہ درست اور مناسب ہے جنہوں نے خیر و شر کے مابین کوئی امتیاز نہیں کیا' جنہوں نے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ دوسری زندگی ہونی چاہئے جس میں انسان کو اپنے اعمال کی بھرپور جزا یا پوری پوری سزا مل جائے۔

بہرحال یہ ہے خلاصہ اس پورے استدلال کا جس کو یہاں پر صرف ایک قسم کے اسلوب سے پیش کیا گیا ہے : ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ "اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ یہاں ذرا وہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے جو سورۃ العصر کے سبق کے ضمن میں عرض کی گئی تھی کہ قسم کا اصل مقصد گواہی اور شہادت ہے۔ گویا وقوعِ قیامت پر ایک تو خود یومِ قیامت گواہ ہے' گویا "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" اور اگر وقوعِ قیامت پر کوئی اضافی گواہی مطلوب ہی ہے تو تمہارا اپنا ضمیر' تمہارا اپنا نفسِ ملامت گر گواہی دے رہا ہے کہ نیکی نیکی ہے' بدی بدی ہے' لہٰذا اس کا بھرپور بدلہ جزا یا سزا کی صورت میں ملنا چاہئے جو اس دنیا میں نہیں ملتا۔ چنانچہ اس کے لئے ایک دوسرا عالم ہونا عین عقل کا تقاضا ہے۔

مناسب ہو گا کہ اس مقام پر اس شخص کا حوالہ بھی دے دیا جائے جسے جدید مغربی فلسفے کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے' یعنی کانٹ' جس نے اپنے فلسفہ میں اخلاقی قانون کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی پہلی کتاب "تنقیدِ عقلِ خالص" (Critique of Pure Reason) میں تو یہ ثابت کیا تھا کہ وجودِ باری تعالیٰ کو کسی منطقی دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر اپنی دوسری کتاب "تنقیدِ حکمتِ عملی" (Critique of Practical Reason) میں یہ بات ثابت کی کہ وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات پر سب سے بڑی دلیل انسان کے اندر کا اخلاقی قانون ہے جو اس کے باطن اور اس کی فطرت میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ یہ خیر و شر اور نیکی و بدی کی تمیز کہاں سے آئی؟

خالص مادے میں یہ شعور کیسے پیدا ہو گیا؟ انسان کے سوا حیوانات میں یہ شعور موجود نہیں ہے۔ حیوانات صرف جبلّت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ انسان کی شان ہے کہ وہ اخلاقی شعور رکھتا ہے اور خیر کی قدر و قیمت کو جانتا ہے اور بدی اور شر سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ خدا کی ہستی پر دو دلیلیں سب سے زیادہ قوی ہیں۔ ایک تو ہمارے اوپر یہ ستاروں بھرا آسمان خدا کی ایک عظیم نشانی ہے اور دوسری نشانی وہ اخلاقی قانون و شعور ہے جو فطرتِ انسانی میں مضمر اور ودیعت شدہ ہے۔ واضح رہے کہ کانٹ نے اخلاقی قانون کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کے لئے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے' جبکہ قرآن مجید وقوعِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

منکرینِ آخرت پر ردّ و قدح

سورۃ القیامہ کی ابتدائی دو آیات میں وارد شدہ قسموں کے بعد' جن کے بارے میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان میں اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے لئے قرآن مجید کا مثبت استدلال جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے' منکرینِ آخرت کے اعتراضات اور شبہات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا گیا :

﴿اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝﴾

"کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکیں گے؟"

پھر فرمایا :

﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝﴾

"کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس (انسان) کی ایک ایک پور کو برابر اور درست کر دیں۔"

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس اسلوب میں اصل وزن متکلّم کی شخصیت کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بات کون کہہ رہا ہے! پھر یہ کہ وہ کس یقین سے کہہ رہا ہے اور کس اذعانی کیفیت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ یقیناً ہم کو اس پر کامل قدرت حاصل ہے کہ ہڈیاں تو ہڈیاں ہم

انسان کی انگلیوں کی ایک ایک پور اور اس کے ایک ایک ریشے کو درست کر دیں اور از سرِ نو بنا دیں۔ بظاہر تو یہ صرف ایک دلیلِ خطابی ہے' لیکن غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس میں ایک عقلی اور منطقی دلیل بھی مضمر ہے۔ اور وہ یہ کہ مخاطب اس بات پر غور کرے کہ آیا وہ اللہ کو بھی مانتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اللہ ہی کو نہیں مانتا تو اس سے بعث بعد الموت اور قیامت و آخرت کے بارے میں گفتگو بے کار اور لاحاصل ہے۔ ایسے شخص سے تو پہلے وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں گفتگو ہو گی۔ لیکن اگر وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کو مانتا ہے تو سوال یہ پیدا ہو گا کہ کیا وہ اللہ کو ہر چیز پر قادر مانتا ہے؟ اگر اس نے اللہ کو "القدیر" اور "القادر" مانا ہے تو اب اس کا اعتراض از خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اللہ ہر چیز پر قادر ہے' تو پھر تمہارا اعتراض کس بات پر ہے؟ تمہارے تمام شکوک و شبہات کے غبارے کی ہوا تو اللہ کو قادرِ مطلق تسلیم کرنے کے بعد خود بخود نکل جاتی ہے' اس لئے کہ جو ہستی ہر چیز پر قادر ہے' وہی ہے جو مُردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے گی۔

دوسری دلیل انسان کے مشاہدات سے دی گئی ہے۔ یہ دلیل اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیات (از ۳۶ تا ۴۰) میں وارد ہوئی ہے جہاں اس استفہامِ انکاری کے بعد کہ "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟" انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ذرا اپنی تخلیق کے اس حصہ پر غور کرے جو اس کے علم میں ہے' یعنی رحمِ مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل جن سے اللہ کی قدرت کاملہ اور اس کی تخلیقی قوتوں کا کسی درجے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان جانتا ہے کہ اس کا آغاز ایک گندے پانی کی بوند سے ہوا۔ پھر اس نے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ پھر اسی لوتھڑے کے اندر سے یہ تمام اعضاء و جوارح' یہ سماعت و بصارت' یہ شعور و ادراک' یہ عقل و فہم' یہ غور و فکر کی استعداد اور حسّی معلومات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت' الغرض انسان کی حیران کن مشینری وجود میں آئی' اور اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تسویہ بھی ہوا' اور اس کی نوک پلک سنواری گئی۔ مزید برآں اسی گندے پانی کی بوند سے کسی کو مرد بنا دیا کسی کو عورت' حالانکہ کوئی بڑی سے بڑی خوردبین بھی یہ فرق نہیں کر سکتی کہ رحم مادر میں نشو و نما پانے والا "نطفۂ امشاج" یعنی مرد کے نطفہ اور عورت کے بیضہ کے اتحاد و امتزاج

سے وجود میں آنے والا واحد خلیہ نر ہے یا مادہ۔ پھر ذرا انسان غور کرے کہ مرد اور عورت کا جسمانی نظام ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہے' اور اس پر بھی مستزاد ان کی نفسیاتی ساخت اور میلانات و رجحانات کے مابین کتنا فرق و تفاوت ہے! اور یہ سب کچھ اس گندے پانی کی بوند سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا نام زبان پر لانا بھی کوئی شائستہ اور مہذّب انسان پسند نہیں کرتا۔ اللہ کی یہ ساری خلّاقی تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس سب کے باوجود بھی تمہیں یہ وسوسہ لاحق رہتا ہے اور تم یہ اعتراض کرتے ہو کہ انسان کے مرجانے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے' یا جل کر راکھ ہو جانے یا کسی درندے یا مچھلی کی غذا بن جانے کے بعد اسے دوبارہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے! اور کیسے دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ اللہ جس کی خلّاقی کا یہ عالم ہے کہ وہ گندے پانی کی ایک بوند سے انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی تخلیق فرما دیتا ہے اس پر قادر نہیں ہو گا کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے!! چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ○ اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ○ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ○ فَجَعَلَ مِنْہُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ○ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ○ ﴾

"کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کو (بلا باز پرس) یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا (ابتداء میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ خون کا ایک لوتھڑا بنا۔ پھر (اللہ نے اس کو انسان کی شکل میں) تخلیق فرمایا۔ پھر اس کا تسویہ فرمایا (اس کی نوک پلک سنواری)۔ پھر اس سے مرد اور عورت کی دو جنسیں بنائیں۔ کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں ہے کہ مُردوں کو زندہ کر سکے؟"

الغرض یہ ہے وہ انسان کے مشاہدے پر مبنی منطقی دلیل جو منکرین قیامت کے وسوسے اور ان کے استبعاد کا قطعی ابطال کر دیتی ہے اور ان کے جملہ اعتراضات کی نفی کر دیتی ہے۔

واضح رہے کہ اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کا مثبت استدلال تو وہ تھا جو اس

سورۂ مبارکہ کے آغاز میں وارد شدہ دو قسموں میں سے دوسری قسم میں اجمال کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوّامہ شاہد ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی میں امتیاز کرتی ہے۔ اب ایک جانب عقل انسانی مطالبہ کرتی ہے کہ ع "گندم از گندم بروید' جوز جو!" کے مطابق نیکی کی بھرپور جزا اور بدی کی پوری پوری سزا ملنی چاہئے' اور دوسری جانب مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں فی الواقع ایسا نہیں ہو رہا' بلکہ بسا اوقات معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ دنیا ناقص ہے' چنانچہ ایک دوسری زندگی ہونی چاہئے جس میں نیکی اور بدی کا بھرپور بدلہ ملے۔ عقل کے اس مطالبے اور فطرت کے اس تقاضے کے مقابلے میں منکرینِ آخرت و قیامت کی جانب سے صرف ایک منفی دلیل پیش کی گئی۔ یعنی صرف یہ استبعاد اور استعجاب کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے اور اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں تو اسے دوبارہ اٹھا لیا جائے۔

اس کا ایک جواب تو خطابی انداز میں دیا گیا کہ : ﴿بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ﴾ یعنی "کیوں نہیں! ہم تو اس کی انگلیوں کی پوروں تک کو درست کرنے پر قادر ہیں"۔ جس میں یہ منطقی دلیل بھی مضمر ہے کہ جب تم اللہ کو مانتے ہو اور اسے ہر چیز پر قادر جانتے ہو تو اب تمہارے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی' اور دوسرا جواب انسان کی رحمِ مادر میں جنین کی حیثیت سے تخلیق کے حوالے سے دیا گیا۔ کس کے لئے ممکن ہے کہ اس ہستی کی قدرت اور تخلیقی قوت کا اندازہ کر سکے جو ایک گندے پانی کی بوند سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا فرما دیتا ہے۔ کیا وہ قادرِ مطلق تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا؟ ظاہر بات ہے کہ اس سوال کا جواب ہر سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان اثبات میں دے گا۔ چنانچہ یہی بات ہمیں نبی اکرم ﷺ نے اس طرح تلقین فرمائی کہ آپؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپؐ اس سورۃ کے اختتام کے بعد فرمایا کرتے تھے : بلٰی وربّنا کیوں نہیں! اے ہمارے رب' ہم اس پر گواہ ہیں کہ تو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔

انکارِ آخرت کے اسباب

اس سورۂ مبارکہ میں دوسرا اہم مضمون یہ سامنے آیا کہ اگر منکرین کا یہ اعتراض منطق اور عقل کی رُو سے بالکلیہ باطل اور قطعاً بے وزن ہے تو پھر ان کے انکار کا اصل سبب کیا ہے اور یہ قیامت و آخرت کے منکر کیوں ہیں' اس کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اس کے تین نہایت اہم اور بنیادی سبب بیان کئے گئے۔

۱۔ فسق و فجور کی عادت : اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ جب انسان فسق و فجور کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے حرام خوری کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ حرام کی کمائی سے حاصل ہونے والی عیش کا خوگر ہو جاتا ہے اور لذّت کوشی اس کی گھٹی میں رچ بس جاتی ہے تو ان سب کا چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ آخرت کو مانے تو اسے حلال و حرام میں تمیز کرنی پڑے گی اور جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ جس طرح کبوتر جب بلی کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے (حالانکہ اس طرح سے بلّی معدوم نہیں ہو جاتی) اسی طرح وہ لوگ جو فسق و فجور کے عادی ہو چکے ہیں اور اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں' بلکہ اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں' وہ آخرت ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے اسی میں عافیت سمجھی ہے کہ روایتی کبوتر کی مانند قیامت و آخرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گویا منکرین قیامت و آخرت کے انکار کا اصل سبب منطقی ہے نہ عقلی' بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حرام خوری اور فسق و فجور کی روش اور لاابالیانہ طرزِ زندگی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا : ﴿بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝﴾ یعنی ان کے اعراض و انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فسق و فجور کی روش کو جاری رکھنا چاہتے ہیں!

۲۔ دنیا کی محبت : آخرت اور قیامت کے انکار کا دوسرا سبب دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝﴾

"ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ عاجلہ سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو!"

یعنی تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو' اور اس کے پرستار بن گئے ہو۔ لفظ "عاجلہ" عجلت سے بنا ہے' اس سے مراد "دنیا" ہے۔ اس لئے کہ اس کا نفع بھی فوری اور نقد ہے اور نقصان بھی فوری اور نقد ہے۔ اس کی لذتیں بھی بالفعل محسوس ہوتی ہیں اور اس کی کلفتیں بھی فوری اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ تم اس عاجلہ سے دل لگائے ہوئے ہو اور آخرت کی زندگی کو نظرانداز اور فراموش کئے ہوئے ہو۔ یہاں عاجلہ کا لفظ استعمال کر کے اس حقیقت کی جانب توجّہ مبذول کرا دی گئی کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ فوری لذتوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور فوری آسائشوں کو قربان نہیں کر سکتے' وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کے برعکس جنہیں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور جو دوراندیش اور دوربین ہوتے ہیں وہ فوری راحت و آرام کو تج دیتے ہیں اور سخت محنت کرتے ہیں یہاں تک کہ راتوں کو جاگتے ہیں تاکہ اپنے دنیوی کیریئر کو روشن بنا سکیں۔ بالکل اسی طرح جو لوگ دنیا کی فوری لذت اور عیش و راحت کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے' جو اس عاجلہ (دنیا) کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس عروسِ ہزار داماد کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں' جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آخرت سے غافل رہتے ہیں اور اللہ کی جناب میں محاسبہ کے لئے کھڑے ہونے کو فراموش کر دیتے ہیں' وہ اخروی زندگی میں لامحالہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر رہیں گے۔ لیکن افسوس کہ انسان مختصر سی حیات دنیوی میں تو مستقبل سے غافل نہیں ہوتا' لیکن آخرت کی ابدی زندگی سے غافل رہتا ہے اور حیات دنیوی کو اس انداز سے بسر کر دیتا ہے کہ ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے
آخرت کی خبر خدا جانے!

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو حکیمانہ اشعار میں دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا نقشہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچ دیا ہے کہ ؎

يَغُوصُ البحرَ مَن طلَبَ اللّٰئالی
ومَن طلَبَ العلٰی سَهِرَ اللّيالی

وَمَن طَلَبَ العُلٰی مِن غَیرِ کَدٍّ
اضاعَ العُمرَ فی طَلَبِ المُحالِی

"جو موتیوں کا طالب ہوتا ہے لامحالہ سمندر میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جو بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بغیر محنت و مشقت کے بلند مقام و مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اپنی عمر ناممکن چیز کی خواہش میں ضائع کر دیتا ہے۔"

گویا بقول حالی مرحوم ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی!

افسوس کہ دنیا میں ایسے انسان تو پھر بھی بہت سے مل جاتے ہیں جو دنیا کے حصول کے لئے محنت و مشقت بھی کرتے ہیں اور راحت و آرام کو بھی تج دیتے ہیں' لیکن آخرت کی کامیابی کے حصول کے لئے اس طرز عمل کے اختیار کرنے والے بہت ہی کم ہیں!

۳۔ **تکبّر و تمرّد** : اس سورۂ مبارکہ میں انکارِ قیامت و آخرت کا جو تیسرا اہم سبب بیان کیا گیا ہے' وہ تکبّر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا :

﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۝ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی ۝ ﴾

"پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی۔ بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔"

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ تابعین کرامؒ میں سے جن حضرات کو تفسیر قرآن سے خصوصی شغف تھا' وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ الفاظ عام ہیں اور ان میں ایک عام متکبر انسان کی نقشہ کشی کی گئی ہے' لیکن یہاں معیّن طور پر ابوجہل مراد ہے۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ابوجہل کے اعراض و انکار اور کفر و تکذیب کا سب سے بڑا سبب تکبّر تھا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے نیچا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسی لئے اس نے تصدیق نہیں کی۔ "فَلَا صَدَّقَ" میں اس کی اسی روش کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ حضورؐ کی تصدیق کرتا

جو خبر دے رہے تھے وقوع قیامت کی اور جو مدّعی تھے اللہ کے نبی اور رسول ہونے کے' تو آپؐ کی تصدیق کے لازمی معنی یہ ہوتے کہ وہ آپؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا اور آپؐ کی اطاعتِ کلی قبول کرتا ہے' اور اس کے لئے اس کی متکبّرانہ طبیعت آمادہ نہیں تھی۔ اسی طرح جو شخص نماز پڑھتا ہے وہ ہمہ تن اللہ کے سامنے جھکتا ہے' جس کا نقطۂ آغاز ہے ادب کے ساتھ جھک کر کھڑے ہونا' اور پھر درمیانی مقام ہے حالتِ رکوع' اور اس کی انتہا ہے حالتِ سجدہ۔ اب بہت سے انسان اتنے سرکش اور متمرد ہوتے ہیں کہ ان کی اکڑی ہوئی گردنیں اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ الغرض تصدیق اور نماز کی راہ میں رکاوٹ اور انکار و تکذیب پر آمادہ کرنے والی اہم چیز ہے تکبر و تمرد' جس کا نقشہ کھینچ دیا گیا ان الفاظ مبارکہ سے کہ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ○ "پھر وہ چل دیا اپنے گھر والوں کی جانب اکڑتا اور اینٹھتا ہوا!"

تین ہولناک مناظر کی نقشہ کشی

اب اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کے تیسرے اہم حصے کی جانب توجہ منعطف کیجئے جو تین مواقع کی منظر کشی پر مشتمل ہے' جن کی ایسی کامل تصویر لفظی پیش کر دی گئی ہے کہ ہوں کے سامنے پورا نقشہ آجاتا ہے۔ چنانچہ ایک نقشہ ہے "السَّاعَة" کا' یعنی وہ بڑی ہل چل جو اس کائنات کے نظام میں آنے والی ہے' جس کے بارے میں سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ یعنی "لوگو! اپنے پروردگار اور اپنے آقا کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ "السَّاعَة" کا زلزلہ بڑی خوفناک چیز اور بہت ہولناک واقعہ ہو گا!"۔ یہ قیامت کی آمد کا پہلا نقشہ ہے جسے قرآن مجید یہاں "السَّاعَة" سے موسوم کرتا ہے۔ اسی کو دوسرے مقامات پر القَارِعَة' الحَاقَّة' الطَّاغِية' الصَّاخَّة اور الطَّامَّة الکبریٰ بھی فرمایا گیا۔ اس "السَّاعَة" کا نقشہ اس سورۂ مبارکہ میں یوں کھینچا گیا:

﴿ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ○ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ○ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ○ ﴾

"جب نگاہ چندھیا جائے گی۔ چاند بے نور ہو جائے گا اور سورج اور چاند ایک کر دیئے جائیں گے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ کششِ ثقل کا جو باہمی نظام ہے' اس کا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا اور یہ بڑے بڑے کُرے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے اور چاند سورج میں دھنس جائے گا۔ تو یہ اس السَّاعَۃ کے ابتدائی احوال ہیں۔ جب یہ کیفیت نظر آئے گی تو یہی انسان جو اس وقت اکڑ رہا ہے' بڑے متکبرانہ انداز میں چیلنج کر رہا ہے کہ : ﴿ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ○ ﴾ "(تحدی کے ساتھ) پوچھتا ہے کہ کب ہو گا قیامت کا دن؟" اس روز اس کا یہ حال ہو گا کہ : ﴿ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ○ ﴾

"یہ انسان کہہ رہا ہو گا کہ ہے کوئی جائے فرار؟ ہے کوئی پناہ گاہ؟ جواباً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے"۔

﴿ كَلَّا لَا وَزَرَ ○ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ○ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ○ ﴾

"ہرگز نہیں! اس روز کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی۔ اس روز تو تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا۔ اس روز انسان کو جتلا دیا جائے گا جو کچھ اس نے آگے کیا (یا آگے بھیجا) اور جو کچھ پیچھے کیا (یا پیچھے چھوڑا)!"

یہ ایک نقشہ تو "السَّاعَۃ" کا ہے جو کھینچا گیا۔ دوسرا نقشہ ہے "یوم القیامۃ" کا ـــــ جس روز لوگ اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہوں گے' نتیجہ کا اعلان ہونے والا ہو گا۔ جیسے کہ آپ نے اسکولوں میں دیکھا ہو گا کہ جس روز سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے تو طالب علم جب کھڑے ہوتے ہیں تو نتیجہ گویا ان کے چہروں پر پہلے ہی سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جو کامیاب ہونے والے ہوتے ہیں' جن کو معلوم ہے کہ ہم امتحان کے پرچے اچھے کر کے آئے ہیں' ان کے چہرے تر و تازہ ہوتے ہیں' انہیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اور جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم فیل ہونے والے ہیں' وہ نتیجہ کے متعلق خود جانتے ہیں کہ وہ کیا ہو گا!

اسی کو اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۱۴'۱۵ میں یوں فرمایا گیا :

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ﴾

"ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور وہ کہاں کھڑا ہے! خواہ وہ کتنے ہی بہانے تراشے' اور معذرتیں پیش کرے اور اپنی چرب زبانی سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کر دے۔"

لیکن وہ اپنی تمام باطنی کیفیات اور اپنے اصل محرکاتِ عمل کو اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا جب وہ بارگاہ ربّ العزّت میں کھڑے ہوں گے تو ان کے چہروں پر ان کا انجام' ان کے امتحان کا نتیجہ لکھا ہوا ہو گا۔ اسی بات کو اگلی آیات (۲۲ تا ۲۵) میں فرمایا گیا : ﴿وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۙ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ۚ﴾ یعنی "اُس روز بہت سے چہرے ہوں گے تر و تازہ اور شاداں و فرحاں' اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار' یا اپنے پروردگار کی جانب دیکھتے ہوئے"۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ ﴿وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ بَاسِرَۃٌ ۙ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِہَا فَاقِرَۃٌ ۚ﴾ "اور کچھ چہرے ہوں گے اس دن سوکھے ہوئے اور اداس' افسردہ و پریشان' اس خیال سے لرز رہے ہوں گے کہ اب ہمارے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے"۔

تیسرا نقشہ جو کھینچا گیا' وہ ہے قیامتِ صغریٰ یعنی عالمِ نزع کا نقشہ' جب اس دنیا سے روانگی کا وقت ہوتا ہے اور انسان کو یقین آ جاتا ہے کہ اب اپنے اہل و عیال اور مال و منال سے جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے : ((مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ)) "جو مر گیا اس کی قیامت تو واقع ہو گئی"۔ یعنی دنیا کی مہلتِ عمل ختم ہو گئی' جیسا کہ امتحان گاہ میں کہا جاتا ہے کہ وقت ختم ہو گیا' لکھنا بند کر دیا جائے اور قلم رکھ دیئے جائیں۔ تو یہ موت درحقیقت مہلتِ عمل کے خاتمے کا نام ہے اور وقوعِ جزا و سزا کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے۔ اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا : ﴿کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۙ وَقِیْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۙ﴾ "ہرگز نہیں! جس روز کہ جان ہنسلیوں میں آن پھنسے گی اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟" ـــــ یعنی اب تو ساری تدبیریں ناکام ہو چکیں اور معالج جواب دے چکے۔ آپ نے دیکھا ہو گا اس موقع پر

بسا اوقات بڑے سے بڑا عقلیت پرست بھی اس تگ و دو میں لگ جاتا ہے کہ کوئی ٹونا ٹوٹکا ہی کام کر جائے اور کسی تیر تکے ہی سے کام چل جائے : ﴿وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝﴾ "اور یقین ہو جائے گا کہ اب جدائی کا وقت آن پہنچا ہے' اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹی ہو گی" ـــــ آخری آیت میں جو حالت بیان فرمائی گئی ہے وہ دنیا سے آخرت کی جانب انتقال (نقل مکانی) کے مختلف مراحل کی نہایت جامع اور فصیح و بلیغ تعبیر ہے یعنی : ﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ۝﴾ (اُس روز کہا جائے گا) آج تو اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے (چار و ناچار' کشاں کشاں)۔

الغرض یہ تین نقشے ہیں' جن کو پیش کرنے سے مطلوب و مقصود یہ ہے کہ جو لوگ آخرت اور قیامت کے منکر ہیں' جو کبوتر کی مانند اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں' جو اپنی فطرت کی گواہی پر غور نہیں کر رہے' اپنے ضمیر کی پکار کو نہیں سن رہے' اس کی خلش پر دھیان نہیں دے رہے' نفسِ ملامت گر کی پروا نہیں کر رہے' جو عقل و خرد اور فہم و ادراک نیز شعور سے کام نہیں لے رہے' ان کے باطن کی بصیرت شاید ان واقعات و حالات کی تذکیر سے جاگ جائے' جن کا وقوع پذیر ہونا یقینی' قطعی اور حتمی ہے' جیسا کہ سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا : ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ "بلاشبہ تم سے جو وعدہ کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے' حق ہے' اور یقیناً جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی۔" گویا جو لوگ ان حقائق کو اپنے شعور و ادراک سے دور رکھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے اپنی نگاہیں بند کئے ہوئے ہیں' اور جو خوابِ غفلت میں مدہوش ہیں' ان نیند کے متوالوں کو اس سورۂ مبارکہ میں مؤثر ترین اسالیب سے جگایا جا رہا ہے اور جو اس کے باوجود نہ جاگیں' بلکہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے رہیں ان کے لئے سورۂ مبارکہ کی آیات ۳۴' ۳۵ میں فرمایا : ﴿اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝﴾ "(اے غفلت شعار!) تیرے لئے افسوس اور ہلاکت ہے' اور پھر افسوس اور بربادی ہے!"

اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے اور ہمارے دلوں میں آخرت کا یقین بھی پیدا فرما دے اور "زلزلۃ الساعۃ" اور "اھوال القیامۃ" کی سختیاں آسان فرما کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے' آمین!

(جاری ہے)